© rasailojaraid.com

محمد عطاء اللہ صدیقی

کاش مسلمانوں میں ''پان اسلام ازم'' ہوتا!

یہ ''پان اسلام ازم'' کیا ہے؟ الفاظ انگریز کے ہیں مگر اس کا مطلب ''اخوت اسلامی اور اتحادِ اسلامی'' کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ معلوم نہیں ''پان اسلام ازم'' کی اصطلاح کس نے وضع کی، مگر یہ جذبات اور نظریہ کسی جمال الدین افغانیؒ مفتی محمد عبدہؒ، یا علامہ اقبالؒ کا وضع کردہ نہیں ہے۔ روزِ اوّل سے مسلمانوں کو اس کی دعوت دی گئی۔ یہ قرآن مجید کے اس ارشاد کی عملی صورت ہی تو ہے ''اور اللہ کی رسی (دین الٰہی) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ نہ کرو'' (البقرہ......)

ہادی برحق، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ''پان اسلام ازم'' کے تصور کا اصل سرچشمہ اور ماخذ ہیں:

''مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے، جیسے ایک جسم واحد کی، اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے''۔ (مسلم و مسند احمد)

بخاری و مسلم کی وہ حدیث بھی ہمیں یہی پیغام دیتی ہے جس کو ابوموسیٰ اشعریؓ نے روایت کیا ہے: ''ایک مومن دوسرے مومن کیلئے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری کو سہارا دیتی ہے''۔

مگر افسوس! آج ہمیں حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کا درس یاد رہا ہے، نہ ملت کے متعلق جسم واحد ہونے کا خیال ہمیں آتا ہے۔ یورپ کی وطنی قومیت کے فسوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہ ایک عظیم المیہ ہے، جس کا امت کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس عظیم المیہ کی نوحہ گری کی جائے۔ مگر جذبات کے اظہار کیلئے ابوالکلام آزادؒ کا قلم کہاں سے لاؤں:

''پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگان قافلہ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں بیرون اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر، جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامئی وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں، جن سے آخری ساعت نزع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اشھدان لا الہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو، اگر آج بلقان کے میدانوں میں جانشین کلمہ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں، اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کیلئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے، کیونکہ ملت اسلام ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں، اس کے اعضاء جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں۔ ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں'' (''الہلال'' ۶ نومبر ۱۹۱۲ء)

۹۰ سال قبل جب ابوالکلام آزادؒ کا قلم معجز بیان جذبوں کی کان سے یہ حرف ہیرے نکال رہا تھا، اس وقت تو حالات بہت بہتر تھے۔ ابھی سلطنت عثمانیہ قائم تھی جس کے غازیوں نے طرابلس، بلقان اور ادرنہ میں عساکر یورپ کے خلاف بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں جوش حمیت بہت حد تک باقی تھا۔ اس وقت اس قوم کے چوٹی کے دماغ ''پان اسلام ازم'' کو اپنی دین ایمان سمجھتے تھے۔ اس وقت اقبالؒ تھے جنھوں نے کہا تھا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

....

اخوت اس کو کہتے ہیں کہ چبھے کانٹا جو کابل میں
ہندوستان کا ہر پیر و جواں بے تاب ہوجائے

آج مراکش، بلقان اور ایران سے زیادہ المناک مناظر افغانستان، فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور احمد آباد کی زمین نے دیکھے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں ''پان اسلام ازم'' کے جذبات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کابل میں کانٹا چبھتا تو ہمارے شاعر ہر پیر و جواں سے بے تاب ہونے کی توقع کرتے تھے مگر آج بے گناہ افغانیوں پر ڈیزی کٹر سے تباہی پھیلائی گئی تو مسلم ممالک امریکہ سے ''تعاون'' کرر ہے تھے۔ اگر ''پان اسلام ازم'' کا وجود ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارے سامنے افغانستان پر قیامت گزر جاتی، احمد آباد میں، مسلمانوں کی لاشیں گلیوں میں رزق سگاں ہوتیں اور ہمارے قلوب گلیشیئر معمولی سے نہ بھی نہ پگھلتے؟ ابوالکلام آزادؒ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا:

''سچ یہ ہے کہ ہم اپنے اصل ''پان اسلام ازم'' کو کھو چکے ہیں اور یہی علت حقیقی اسلام کے اصل ضعف اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انحطاط کی ہے''۔

انیسویں صدی کے نصف تک کرہ ارضی پر رہنے والے مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح دھڑکتے تھے کہ سیاسی اعتبار سے ان پر ''جسد واحد'' اور امت واحدہ کی اصطلاحات صادق آتی تھیں۔ یورپین اقوام نے نو آبادیاتی استعماریت کے پھیلاؤ کے بعد مسلمانوں میں نیشنلزم کے زہریلے اثرات کو پھیلانا شروع کیا۔ سلطنت عثمانیہ جو تمام دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعی امنگوں کا مرکز تھا۔ اس کے خلاف عربوں کو قوم پرستی کی تحریک کے تحت ابھارنا شروع کیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ملت اسلامیہ کی وحدت میں پہلی مرتبہ شدید دراڑیں محسوس ہوئیں تو امت کی فکر رکھنے والے مسلمان دانش مندوں نے ''پان اسلام ازم'' یعنی عالمی اسلامی برادری کے تصور کو ایک دفعہ پھر نئے فلسفیانہ اسلوب میں پیش کیا۔ ان فرزندان ملت میں جمال الدین افغانیؒ اور مفتی محمد عبدہؒ اور برصغیر پاک و ہند میں ان سے پہلے شاہ ولی اللہؒ کے خاندان نے ان نظریات کو مسلمانوں میں دوبارہ زندہ کرنے کی نظریاتی تحریک شروع کی۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں ہندوستان میں علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، علی برادرانؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور دیگر اکابرین امت نے اتحاد ملت اسلامیہ کی بھرپور تبلیغ کی، تحریک خلافت ''پان اسلام ازم'' Climax (نقطہ عروج) تھی جب مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ کر دیا تو مسلمانوں کا حقیقی یا موہوم ''مرکز ملت'' پارہ پارہ ہو گیا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد یورپی نو آبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کے ملکوں کو سیاسی طور پر آزاد تو کر دیا مگر انہیں اس طرح چھوٹے چھوٹے ملکوں اور قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا کہ رفتہ رفتہ اجتماعی وحدت کی بجائے جغرافیائی تقسیم ایک سیاسی غیر متبدل حقیقت کی صورت اختیار کر گئی۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں تو صورت حال اس قدر پریشان کن ہو گئی ہے کہ ملت اسلامیہ کی وحدت ایک غیر متوازن رومانوی تصور اور ایک خواب پریشان لگتا ہے۔ اس المناک صورت حال کے پیدا کرنے میں مغربی ذرائع ابلاغ، سیکولر حکمرانوں کی تہذیب مغرب سے جذباتی وابستگی اور ہوس اقتدار میں ڈوبے ہوئے مسلمان حکمرانوں نے نہایت منفی کردار ادا کیا ہے۔ اتاترک نے خلافت کی بجائے جس طرح علاقائی اور قومی ریاست کے مغربی تصور کو مسلمانوں کی ریاست میں عملی جامہ پہنایا تھا، رفتہ رفتہ عالم اسلام کے سیکولر حکمرانوں نے اس فلسفہ کو اپنا سیاسی نصب العین بنا لیا۔

اس ملک میں جہاں ''سب سے پہلا پاکستان'' کا نعرہ نہ صرف حکومتی پالیسی کا حصہ ہو، بلکہ دانشوران قوم اور حکمائے ملت کی ایک معتدبہ تعداد اسے حکمت و دانش کا عین مظہر تسلیم کرنے میں قلم و قرطاس کے سارے وسائل بھی بروئے کار لا چکی ہو، وہاں ''پان اسلام ازم'' کی تذکیر ایک عصری تقاضوں سے ناوار رومانیت، ایک بے موسمی دیوانگی اور ایک پاگلانہ جنون نہیں تو اسے اور کیا نام دیجیے گا۔ ہمارے حکمت و دانش میں ڈوبے ہوئے عقول مقدمہ کی جانب سے افغانستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مسلمانوں کی حمایت کرنے والوں کو جس طرح قلمی عتاب کے زیر بار رکھا گیا ہے، اس کو دہرانا بھی تحصیل حاصل ہوگا، مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ امت مسلمہ میں ایسے حکمت مآب وجود ظہور پاتے رہے ہیں۔ ابوالکلام آزادؒ، شبلیؒ، اقبالؒ، محمد علی جوہرؒ اور علمائے دین کی طرف سے خلافت عثمانیہ کی تائید میں پیش کردہ ''پان اسلام ازم'' کو سرسید اور ان کے ہم خیال متفرنجین ومتجددین تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ آج سرسید احمد خان کا نام بھی اقبال اور جناح کے پیش روؤں میں لیا جاتا ہے۔ ان کو ''محسن ملت'' بھی قرار دیا جاتا ہے، مگر ان ''بزرگ'' کو ملت اسلامیہ سے کس قدر ''لگن'' تھی۔ اس کا مرقع آج کی نوجوان نسل کے سامنے کم ہی پیش کیا جاتا ہے۔ موصوف سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں ہمیشہ انگریزوں کی کاسہ لیسی اور اطاعت کی تبلیغ فرماتے رہے۔ سرسید اور ان کے بعض رفقائے علی گڑھ شروع میں ''پان اسلام ازم'' کے خلاف تھے۔ مگر مسلمانوں کے عمومی جذبات کے سامنے انہیں اپنی فکر سے رجوع کرنا پڑا۔ یہاں مناسب ہوگا کہ اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ایک تحریر سے اقتباس پیش کر دیا جائے، مولانا آزادؒ لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق' کی اشاعت اوّل میں سید مرحوم نے ایک مضمون ''شیخ الاسلام'' کے عہدے اور اختیارات کی نسبت لکھا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ مذہباً فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کے ہمیشہ تابع رہیں، گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور گو ترکی میں اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے''۔

۱۸۹۸ء میں جب ترکی نے یونان پر فتح پائی تو بمبئی کے مسلمانوں نے کہا کہ مسلمان تھے، اس لئے مسلمانوں کی فتح اور کفار کی ہزیمت سے خوش ہوتے تھے۔ سلطان المعظم (عثمانی خلیفہ) کی خدمت میں مبارک باد کا ایک تار بھیجا، اس پر سید صاحب کو اس قدر غصہ آیا کہ انہوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں ایک مضمون لکھا، جس میں اس حرکت کو ''خفیف الحرکتی'' سے تعبیر کیا تھا، نیز لکھا تھا کہ ''ہم کو صرف اپنی گورنمنٹ سے سروکار رکھنا چاہیے اور جو کچھ کرنا چاہیے، اس کی رضا اور حکم سے ہو۔ یہ بھی لکھا کہ بمبئی کے مسلمانوں کو ہرگز نہیں چاہیے تھا کہ تاج برطانیہ کے محکوم ہو کر ترکی کو مبارک باد دیں''۔ (ہفت روزہ ''الہلال'' جلد اوّل ۲۶ر نومبر ۱۹۱۲ء)

مولانا ابوالکلام آزادؒ مزید لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۰۵ء میں انگریزی گورنمنٹ نے ترکی سے مصر کا ایک علاقہ زبردستی لینا چاہا، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا۔ علی گڑھ میں بھی بعض لوگوں نے ایک جلسہ کر دیا۔ جلسے کی جب کارروائی چھپی تو بزرگان علی گڑھ کو کھٹکا ہوا کہ علی گڑھ کے نام سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے، وستگان کالج میں خدانخواستہ اس کفر میں شریک ہیں۔ فوراً مقامی ارکان کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی اور انکار و بریت کا ایک تار Poineer میں چھاپا گیا۔ آزادؒ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی اس واقعہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعلق ایک ادارتی نوٹ روزنامہ ''وکیل'' میں تحریر کیا جس میں علی گڑھ کی پالیسی پر بھی اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ مزید ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''لیکن خدا بخشے نواب محسن الملک مرحوم اس قدر برآشفتہ خاطر ہوئے کہ علی گڑھ گزٹ میں ''کالج کے نادان دوست'' کے نام سے ''وکیل'' کے جواب میں ایک پرغضب مضمون لکھا اور اس میں سید صاحب کے مضامین کے اقتباسات دے کر ثابت کیا کہ ہم مسلمانوں کو ترکوں کے معاملات اور خلافت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ایک خط میں مجھے بمبئی سے لکھا کہ ''ہماری تیس برس کی کمائی کو تم لوگ چاہتے ہو کہ غارت کر دو''۔

اس کے بعد متواتر دو پمفلٹ بھی اردو اور انگریزی میں اس مسئلہ نسبت سے شائع کئے اور ان میں غالباً یہ بھی لکھا کہ سوائے چند غیر ذمہ دار اور ناقابل غیرت مسلمانوں کے اور کوئی معقول اور تعلیم یافتہ مسلمان ترکوں کے ان معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا''۔ (حوالہ ایضاً)

مگر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے دوران علی گڑھ کی پالیسی یکسر تبدیل شدہ نظر آتی ہے۔ ترکوں کی حمایت کرنے والوں کو ناقابل عزت مسلمان کی گالی دینے والے بزرگان علی گڑھ خود مسلمان ترکوں کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ میں ترکوں کی حمایت میں باقاعدہ ایک جلسہ ہوا۔ اس انقلاب حال پر مولانا ابوالکلام کا طنز و استعجاب سے بھرپور تبصرہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''یہ کیا قیامت ہے کہ علی گڑھ میں ہندوستان سے باہر کسی ایک جنگ کی نسبت جلسہ منعقد کیا گیا، اکثر ارکان اور مقامی ٹرسٹی اس میں شریک ہوئے اور یہاں تک اس کی پیمان شریعت کے عہد شکنوں کا عدوان بڑھا کر اعلانیہ چندے تک ترکوں کیلئے دیئے گئے تاریخی واقعات بھی بعض اوقات ماضی، حال کے حوالے سے عجب مشابہت رکھتے ہیں۔ قائدین علی گڑھ کی ''پان اسلام ازم'' کے بارے میں تذکرہ، جملہ ہائے معترضہ ہی سمجھا جائے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب کے احمد آباد کے فسادات کے متعلق احتجاجی بیان اور علی گڑھ کے بزرگوں کا جنگ بلقان کے دوران ترکوں کی حمایت میں جلسہ کرنے کا اقدام بظاہر ایک جیسے تو نہیں لگتے۔ لیکن نجانے ''دیوانگی تخیل'' ان دونوں میں مشابہت ڈھونڈنے کی کوشش کیوں کرتی ہے؟

نجانے کیوں جی چاہتا ہے کہ کہہ دیں کہ آج ہمیں ''حکمائے ملت'' کی بجائے ''مجذوبانِ ملت'' کی زیادہ ضرورت ہے۔ ''پان اسلام ازم'' کا ذکر جنہیں سمجھا جاتا ہے تو کیا ہوا؟ یہ امت افرنگ پسند ''فرزانوں'' کی بجائے اسلام پسند ''دیوانوں'' کی قیادت کو ترس رہی ہے۔

اے کاش، مسلمانوں میں ''پان اسلام ازم'' کا وجود ہوتا! ملت کے مصائب کا علاج حقیقی ''پان اسلام ازم'' میں ہی ہے۔ اے کاش ''ملت مرحوم'' کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا!

© rasailojaraid.com